یہ تو کیڑے ہیں

یہ کئی برس پرانا واقعہ ہے۔ میں اپنے بھائی کے دوست سے ملنے گیا جن کا ہمارے خاندان سے بہت گہرا تعلق تھا۔ یہ ایک سادہ مزاج، دیندار اور کاروباری شخصیت تھے۔ اتفاق سے اس وقت کراچی کے سابقہ میئر عبدالستار افغانی مرحوم ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے دوست مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑے جوش و جذبے سے میرا تعارف افغانی صاحب سے کرانے لگے۔ اس تعارف کا ایک جملہ مجھے نہیں بھولتا جو اس طرح تھا۔ ''یہ تو کیڑے ہیں۔''

یہ بظاہر ایک بڑے آدمی کے سامنے میری بے عزتی تھی، مگر درحقیقت یہ میری تعریف تھی۔ ہمارے دوست دراصل میرے علمی ذوق کو بیان کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے لیے جو تعبیر انھوں نے اختیار کی وہ کتابی کیڑے کی تھی اور شدت جذبات میں اس تعبیر سے کتابی کا لفظ رہ گیا۔ یوں جملہ یہ ادا ہوا کہ یہ تو کیڑے ہیں۔ چنانچہ ان کی اس بات کا میں نے کوئی برا نہیں مانا اور افغانی صاحب بھی بغیر کسی وضاحت کے سمجھ گئے کہ وہ کہنا کیا چاہ رہے تھے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ ان صاحب سے ہم واقف تھے۔ جن لوگوں سے ہم واقف ہوتے ہیں، ہم کبھی ان کے سرسری الفاظ، ظاہری رویے، کسی خاص واقعے سے ان کا تاثر نہیں لیتے ہیں۔ بلکہ ان کی مجموعی شخصیت اور مثبت خصوصیات کی بنیاد پر ان کی باتوں اور کاموں کا مقصد متعین کرتے ہیں۔ یہی مثبت کردار کی خوبی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس منفی کردار کا حامل شخص ایک شکاری کی طرح ان لوگوں کی تاک میں بھی لگا رہتا ہے جن کا اس سے برسہا برس کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ ہر سیدھی بات میں بھی منفی پہلو تلاش کرلیتا ہے۔ جہاں دو آراء قائم کی جاسکتی ہیں وہاں ہمیشہ منفی چیز دیکھتا ہے۔ اور بالفرض کوئی ''یہ تو کیڑے ہیں'' جیسی بات سامنے آجائے تو وہ پوری قوت سے سامنے والے پر حملہ آور ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ تعلق خاطر کی ہر جہت کو کونے میں رکھ کر اپنا بدلہ چکاتا ہے اور یوں انسانی تعلقات خراب ہوجاتے ہیں۔ درحقیقت اجتماعی تعلقات کی بقا کا راز لوگوں سے حسن ظن رکھنا اور مثبت بنیادوں پر معاملات کو دیکھنا ہے۔ ورنہ دنیا کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا۔

سابقین اور بعد والے

''اے ہمارے رب ہماری بخشش فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے ایمان میں سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں ان اہل ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا کیجیے گا۔ اے ہمارے رب تو بہت روف ورحیم ہے۔''، (الحشر 10:59)۔

قرآن مجید کی یہ دعا اس تعلق کا بڑا خوبصورت بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کو اہل ایمان کے درمیان مطلوب ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے حوالے سے جو ایمان کی سمت دوڑ لگا رہے ہوں۔ اس دوڑ میں جو لوگ سبقت لے جاتے ہیں وہ بلا شبہ بڑے مرتبے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے نزول قرآن کے وقت مہاجرین اور انصار کا معاملہ تھا۔ ابتدا ہی سے کسی خیر کی طرف متوجہ ہو جانا بڑے مرتبے کی بات ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دعوت پھیلتی ہے یہ سابقین اہل ایمان کسی نہ کسی پہلو سے نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ایسے میں امکان یہ ہوتا ہے کہ بعد میں ایمان لانے والے، ان قدیم الایمان لوگوں کو اپنا حریف سمجھ بیٹھیں۔ وہ دیکھیں کہ وسائل پر بھی یہی لوگ قابض ہیں، نام بھی ان کا ہی ہو رہا ہے، خدمات بھی ان کی ہی سراہی جا رہی ہیں۔ جس کے بعد وہ ان کی ساری جدوجہد، قربانیوں اور ایثار کو بھول کر منفی سوچ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے بچانے کے لیے اہل ایمان کی یہ دعا ہمیشہ کے لیے قرآن مجید کا حصہ بنا دی گئی۔

یہ دعا بتاتی ہے کہ بعد میں آنے والے سابقین کے احتساب کے مقام پر کھڑے ہونے کے بجائے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ ان کی کوئی کوتاہی نظر آئے تو ان کے لیے بھی معافی کی درخواست کرتے ہیں۔ اپنے دلوں کو عداوت کی آماجگاہ بنانے کے بجائے کینہ وکدورت سے بچاتے ہیں۔ یہی لوگ بلا شبہ پیچھے ہونے کے باوجود اجر میں سابقین کے ساتھ آ کھڑے ہوں گے۔

انقلابی اور تدریجی تبدیلی

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں۔ وہ جو چاہیں لمحہ بھر میں ایک انقلابی تبدیلی کے ذریعے سے کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی اس طاقت کے بالکل برعکس انھوں نے اس کائنات میں جو طریقہ رائج کر رکھا ہے وہ انقلابی تبدیلی کا نہیں بلکہ تدریجی تبدیلی ہے۔ مثلاً انسان، جانور، نباتات حتیٰ کہ زمین اور سورج بھی ایک تدریجی تبدیلی سے گزر کر اپنے کمال کو پہنچتے ہیں۔ ہاں اس کائنات میں انقلابی تبدیلی کا طریقہ بھی رائج ہے۔ مگر انقلابی طریقہ صرف اس بات کا تعارف کراتا ہے کہ انقلابی تبدیلی ہمیشہ تباہ کن ہوتی ہے۔ جیسے زلزلہ، سونامی، طوفان اور سیلاب سب انقلابی تبدیلی لاتے ہیں، مگر یہ تبدیلی تباہی کی نوعیت کی ہوتی ہے۔

ان دونوں طرح کے ماڈل میں اللہ نے یہ نمونہ رکھا ہے کہ تعمیری تبدیلی ہمیشہ تدریجی ہوتی ہے اور انقلابی تبدیلی تباہ کن ہوتی ہے۔ انسانی معاشرے بھی اس کے گواہ ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں انسانیت پر سب سے زیادہ اثر مغربی تہذیب نے پیدا کیا ہے۔ مگر خود مغربی تہذیب کئی صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد اس مقام تک پہنچی۔ اس کے برعکس سوویت انقلاب کی تبدیلی نے آدھی دنیا کو متاثر کیا۔ مگر اس انقلاب کے آغاز، استحکام اور خاتمہ تک کروڑوں لوگ مارے گئے، سوویت یونین ٹوٹ گیا اور اور صرف ستر برس میں اس نظریہ کی موت واقع ہوگئی۔

ان سارے حقائق کے باوجود پاکستان میں بار بار انقلابی تبدیلی کی بات ہوتی ہے۔ حالانکہ ہماری قوم سے زیادہ انقلاب شاید ہی کسی نے دیکھیں ہوں۔ پچاس کی دہائی میں سیاسی قیادت کی ناپختگی اور نااہلی کی وجہ سے ملک میں ایک مستقبل بحران جاری تھا۔ اس کے بعد ایک انقلاب آیا۔ بظاہر ملک میں تیزی سے ترقی ہوئی، مگر اس عشرہ انقلاب میں مشرقی پاکستان میں جو لاوا پکا اس کی بنا پر جلد ہی ملک ٹوٹ گیا۔

یہی معاملہ ستر کے عشرے میں ہوا جب بھٹو صاحب کو اس دور کے سب بڑے ولن کے طور پر پیش کیا گیا۔ دھاندلی کے الزام لگے۔ پھر ایک اور انقلاب جو پھر ایک عشرہ جاری رہا، مگر جب یہ انقلاب رخصت ہوا تو ملک منشیات، ناجائز اسلحہ، تخریب کاری، فرقہ واریت، لسانی اور صوبائی عصبیت کی دلدل میں دھنس چکا تھا۔ نوے کی دہائی میں میاں صاحب اور بی بی صاحبہ پر کرپشن اور نااہلی کے الزام لگا کر ان کی حکومتوں کو بار بار رخصت کیا گیا۔ پھر مشرف صاحب کا انقلاب آیا۔ مگر جب مشرف صاحب کا یہ دور حکومت ختم ہوا تو انتہا پسندی اور دہشت گردی پاکستان کی شناخت بن چکے تھے۔

بے نظیر صاحبہ نے صدر مشرف کو ہٹانے کے لیے شراکت اقتدار کا ایک تدریجی طریقہ اختیار کرنا چاہا۔ وہ اگر اس تدریجی طریقے میں کامیاب ہوجاتیں تو پاکستان کو کبھی زرداری صاحب کا وہ بدترین دور نہ دیکھنا پڑتا، مگر بدقسمتی سے ایک انقلابی تحریک کے ذریعے سے جب مشرف صاحب کو ہٹایا گیا تو جو ہوا وہ اتنی پرانی بات نہیں کہ لوگوں کو یاد دلانا پڑے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بار بار کے تجربات کے بعد پاکستانی قوم سیکھتی کیوں نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ تدریجی تبدیلی سے آنے والے لوگ جس سسٹم سے آتے ہیں وہاں اپوزیشن اور میڈیا دونوں کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی غلطیاں بیان کریں۔ اقتدار چونکہ بڑی خرابیاں پیدا کرتا ہے، اس لیے خرابی تو بہرحال ہوتی ہے، مگر اپوزیشن اور میڈیا اس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ یوں حکمران اور شیطان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جبکہ انقلابی طریقے سے آنے والے لوگ نہ اپوزیشن برداشت کرتے ہیں نہ اختلاف رائے، نہ میڈیا کو آزادی دیتے ہیں نہ صحافیوں کو۔ چنانچہ ان کی بڑی سے بڑی خرابی پر پردہ پڑا رہتا۔ یہ پردہ دس سال بعد جب اٹھتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور ملک کو اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ زرداری صاحب کے دور کے عیوب جب بیان ہوتے رہے تو پانچ سال بعد ہی عوام نے ایک اصولی انداز میں انھیں اقتدار سے رخصت کردیا۔ یہی تدریجی طریقے کی خوبی ہوتی ہے کہ خرابی کے حد سے بڑھنے سے پہلے ہی اس کی جڑ ختم کردی جاتی ہے۔

اس وقت ملک میں جو کچھ ہورہا وہ ایک دفعہ پھر ناسمجھی کی کہانی ہے۔ ہم کسی صورت موجودہ حکمرانوں کے غلط رویوں کے حامی نہیں۔ مگر ان کی خرابیوں کو بنیاد بنا کر کسی انقلابی طریقے سے تبدیلی لانے کی کوشش کی گئی تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ہے کہ اس طریقے نے پاکستان کو پہلے بھی نقصان پہنچایا ہے اور آئندہ بھی پہنچائے گی۔ اس وقت اگر کوئی اصلاح چاہتا ہے تو اس کے لیے درست راستہ یہ ہے کہ الیکشن کو منصفانہ بنانے کی کوشش کی جائے اور اقتدار کی مدت چار سال مقرر کی جائے تاکہ عوام کو جلد احتساب کا موقع ملے۔ اس کے علاوہ ہر دوسرا راستہ تباہی کی طرف جائے گا۔

آخری فیصلہ

محمد عامر خاکوانی کا شمار ان گنے چنے اہل صحافت میں ہوتا ہے جو اہل دانش میں سے بھی ہیں اور توازن، مثبت اندازفکر، رجائیت پسندی جن کی شناخت ہیں۔ان کے مضامین ان کی انہی خصوصیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ان کا ایسا ہی ایک مضمون ''تصویر کا چھوٹا سے ٹکڑا'' ان کی اجازت سے ہم اس ماہ کے رسالے میں شائع کرر ہے ہیں۔ یہ مضمون ایک چینی کہانی کو بنیاد بنا کر یہ پیغام دیتا ہے کہ کسی ایک اچھے برے واقعے کی بنیاد پر زندگی کا حتمی فیصلہ نہیں ہوتا۔ایک واقعہ بظاہر اچھا ہوتا ہے، مگراس کے ساتھ شر جڑا ہوسکتا ہے۔اسی طرح بظاہر ایک برا واقعہ بھی ایک خیر عظیم کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

اس چینی کہانی کو جب میں نے پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ قاری کے ذہن میں ایک سوال چھوڑ گئی ہے۔وہ یہ کہ آخر کو وہ کیا واقعہ ہوگا جس کی بنیاد پر زندگی کی حتمی خوش قسمتی یا بدقسمتی کا فیصلہ کیا جاسکے۔چینی تہذیب بڑی غیر معمولی سہی مگر وحی کی روایت سے محرومی کی بنا پر اس سوال کا جواب نہیں رکھتی۔اس سوال کا جواب صرف نبی عربی علیہ السلام کے پاس ہے۔وہ جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی خوش نصیبی اور بد نصیبی کا حتمی اور آخری فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔جو اس روز محروم رہا وہ اصل بد بخت ہے اور جو اس روز جنت کی کامیابی پا گیا وہ ہی کامیاب ہے۔

یہی وہ پیمانہ ہے جس پر ہمیں زندگی کے ہر اچھے برے واقعے کو پرکھنا چاہیے۔ہمیں اگر بہت دولت، شہرت اور کامیابی مل گئی اور اس نے ہمیں اخلاقی طور پر ایک پست انسان بنا دیا تو جان لینا چاہیے کہ یہ ہماری خوش نصیبی نہیں بد نصیبی ہے۔کیونکہ اس کا نتیجہ جہنم ہے۔اور اگر اپنے پریشان کن حالات کے باوجود ہم صبر، ایمان اور اخلاق کے راستے پر رہے تو آخر کار وہ اجر پائیں گے کہ آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں گی۔یہی کسوٹی زندگی کے ہر واقعے کے خیر وشر کو پرکھنے کا اصل معیار ہے۔

محمد عامر خاکوانی

تصویر کا چھوٹا سا ٹکڑا

کئی سال پہلے ایک چینی کہانی پڑھی تھی، آج تک اس کے سحر سے نہیں نکل سکا، اس نے سوچنے اور چیزوں کو دیکھنے کا انداز ہی بدل دیا۔ایک بار پہلے بھی اس کا ذکر کیا تھا،ممکن ہے آپ میں سے بعض نے یہ کہانی سنی ہو، اشفاق صاحب نے بھی ایک بار یہ سنائی تھی۔ دوبارہ سن لیں، کہتے ہیں کہ کہانیوں کا سحر وقت گزرنے کے ساتھ گہرا ہوجاتا ہے۔قدیم چینی دور کی کہانی ہے۔ کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک بوڑھا اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ پرانا سا ایک مکان تھا، ایک کمرے میں باپ بیٹا رہتے، دوسرے کمرے کو اصطبل بنایا ہوا تھا، وہاں ان کا گھوڑا رہتا ہے۔ یہ گھوڑا بڑا شاندار اور نہایت اعلیٰ نسل کا تھا۔ بہت پہلے بوڑھے کسان کے ہاتھ ایک گھوڑے کا بچہ لگا، اس نے باپ کی طرح اسے پالا۔ بڑا ہوکر اس گھوڑے کی خوبصورتی کی دھوم مچ گئی۔ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے۔ گاؤں کے رئیس نے اسے دیکھا تو پہلی نظر میں فریفتہ ہوگیا، اس نے بوڑھے کو بلا کر منہ مانگی قیمت کی پیش کش کی۔ کسان نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ گھوڑا نہیں، میرا بیٹا ہے، اپنی اولاد کو کوئی فروخت نہیں کرتا۔اور بھی لوگوں نے خریدنے کی کوشش کی، سب ناکام رہے۔گاؤں کے کچھ سمجھدار لوگوں نے بوڑھے کو سمجھایا کہ تم غریب آدمی ہو، ایسے اعلیٰ گھوڑے کو کتنی دیر تک سنبھال کر رکھو گے، اچھی قیمت مل رہی ہے، بیچ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی یہ گھوڑا اچرا کر لے جائے۔ایسے ہر مشورے کے جواب میں وہ بابا جی مسکرا دیتے اور بس، بات ختم ہوجاتی۔

ایک دن بوڑھا کسان اور اس کا بیٹا حسب معمول صبح اٹھے تو دیکھا کہ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور گھوڑا غائب ہے۔ پریشان ہوکر آس پاس دیکھا، مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ بستی والوں کو پتہ چلا تو وہ افسوس کرنے آئے۔جن لوگوں نے گھوڑا بیچنے کا مشورہ دیا تھا، انہوں نے فٹ

سے طعنہ دیا کہ تمہیں سمجھایا تو تھا کہ گھوڑا بیچ دو، اس وقت نہیں مانے۔ اب تمہاری بدقسمتی کہ بغیر کچھ لئے گھوڑا گنوا بیٹھے۔ کسان یہ سب باتیں سنتا رہا، پھر بڑے اطمینان سے بولا، بھائیو، تمہاری بڑی مہربانی کہ میرے پاس آئے، اپنی ہمدردی کا اظہار کیا، مگر مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس میں بدقسمتی کہاں سے آ گئی۔ یہ درست ہے کہ میرے پاس گھوڑا تھا، جو مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا، آج صبح وہ گھوڑا اپنے کمرے سے غائب ہے۔ اس حد تک تو یہ بات درست ہے، مگر اس کے بارے میں ابھی سے یہ کیسے طے کر لیا گیا کہ یہ بدقسمتی ہے؟ گاؤں والے بڑے حیران ہوئے، آپس میں کہنے لگے کہ شائد صدمے کی وجہ سے بابے کا دماغ چل گیا ہے، یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہزاروں کی مالیت کا گھوڑا چوری ہو گیا۔ بڑبڑاتے ہوئے سب لوگ واپس چلے گئے۔ دو تین دن بعد اچانک وہ گھوڑا واپس آ گیا، اپنے ساتھ وہ جنگل سے صحت مند، اعلیٰ نسل کے اکیس نوجوان گھوڑے بھی لے آیا۔ گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ لوگ آ کر بوڑھے کو مبارکباد دینے لگے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ہم نے اس روز غلط بات کی تھی، گھوڑے کا چلا جانا بدقسمتی نہیں تھی، اصل میں تو تمہاری خوش قسمتی تھی، آج پورے اکیس گھوڑے تمہارے گھر آ گئے۔ کسان نے حیرت سے یہ سب تبصرے سنے اور پھر کہا، بھائیو، مجھے ایک بار پھر تمہاری باتوں کی سمجھ نہیں آئی، میرا گھوڑا واپس آ گیا، یہ درست ہے کہ وہ اکیس گھوڑے لے آیا ہے، مگر اس میں خوش قسمتی کی کیا بات ہے؟

گاؤں والے یہ سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ چند دن گزر گئے، کسان کا بیٹا ان جنگلی گھوڑوں کو سدھانے کی کوششوں میں مصروف تھا، ایک دن ایک سرکش گھوڑے نے اسے ایسی پٹخنی دی کہ اس کی ٹانگ ہی ٹوٹ گئی، طبیب نے دیکھا بھالا اور تین مہینوں کے لئے بستر پر آرام کی ہدایت کی۔ ایک بار پھر گاؤں امنڈ آیا۔ ہر ایک نے بوڑھے کے ساتھ ہمدردی کی۔ چند ایک

نے صاف گوئی کے ساتھ اعتراف کیا کہ بابا جی آپ ہی ٹھیک تھے، ان اکیس گھوڑوں کا آنا خوش قسمتی نہیں بلکہ درحقیقت بدقسمتی کا اشارہ تھا۔ آپ کا اکلوتا سہارا، نوجوان بیٹا زخمی ہوگیا، نجانے اس کی ٹانگ درست طور پر جڑتی بھی ہے یا نہیں، آپ بوڑھے بندے ہو، تمام کام کاج بیٹا کرتا تھا، اب مشکل ہوگی، آپ کی قسمت خراب ہے کہ ایسا ہوگیا۔ بوڑھے کسان نے یہ سن کر ٹھنڈی سانس بھری اور قدرے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا، یارو ہر واقعے میں خوش قسمتی یا بدقسمتی نہ ڈھونڈ لیا کرو، جو بات جتنی ہے، اتنی ہی بیان کرو، اتنی قطعیت سے کوئی فیصلہ کن رائے نہ دیا کرو، میرا بیٹا گر کر ٹانگ تڑوا بیٹھا، اس حد تک تو تمہاری بات درست ہے، باقی خوش قسمتی یا بدقسمتی کا حتمی فیصلہ ابھی ہونا باقی ہے، قدرت ہی اس کے بارے میں بہتر جانتی ہے۔

دو تین ہفتے گزرے، اچانک ہی جنگ چھڑ گئی، قریبی ملک کی فوج نے حملہ کر دیا۔ بادشاہ نے جبری بھرتی کا حکم دیا۔ ریاستی اہلکار دوسرے دیہات کی طرح اس گاؤں میں بھی آئے اور بوڑھے کسان کے زخمی بیٹے کے سوا ہر نوجوان کو پکڑ کر لے گئے۔ گاؤں والے روتے پیٹتے بابے کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم تو تمہیں بے وقوف سمجھتے تھے، تم تو ہم سب سے زیادہ سیانے نکلے۔ واقعی تمہارے بیٹے کا حادثہ بدقسمتی نہیں تھا۔ سچ پوچھو تو تمہاری انتہائی خوش قسمتی تھی، ہم سب کے بیٹے جنگ لڑنے چلے گئے، معلوم نہیں واپس لوٹتے بھی ہیں یا نہیں، تمہارا بیٹا تو چلو تین چار ماہ میں ٹھیک ہو جائے گا۔ بوڑھے کسان کے پاس سوائے سر پیٹنے کے کوئی چارہ نہیں تھا، بے چارگی سے اس نے کہا، بھائیو! اگر تم لوگ اصل بات کو سمجھ لیتے تو کبھی اتنا پریشان نہیں ہوتے۔ ہم سب بہت جلدی کسی واقعے پر خوش قسمتی، بدقسمتی کا لیبل لگا دیتے ہیں، حالانکہ یہ سب تصویر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں، ہم میں سے کسی کے پاس مکمل تصویر نہیں، تصویر کا ایک ٹکڑا ہی ہوتا ہے۔ اسی ٹکڑے کو ہم مکمل تصویر سمجھ لیتے ہیں۔ ایک ٹکڑا کبھی تصویر کو درست طریقے سے بیان نہیں کر سکتا، اس کے رنگ تک نہیں بتا سکتا۔ ہمیں حتمی رائے دینے کے بجائے انتظار کرنا چاہیے، جو

واقعہ ہوا ہے، اسے اتنا ہی سمجھنا اور ماننا چاہیے۔

کہانیاں اپنے اندر صدیوں کی دانش اور تجربات کا نچوڑ سموئے ہوتی ہیں، انہیں اس لئے سنایا جاتا ہے کہ کچھ سیکھا جائے۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ اپنے ملک کے حوالے سے کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے اس کہانی کو ضرور ذہن میں دہرا لیا کریں۔ ملک کی سیاسی یا سماجی تاریخ ہو، کسی واقعے کو ایک واقعہ ہی سمجھنا چاہیے، اس کی بنیاد پر پوری قوم اور پورے ملک کے مستقبل کا فیصلہ سنا دینا دانشمندی نہیں۔ تصویر کے مختلف ٹکڑے باری باری سامنے آتے ہیں، مکمل تصویر دیکھے بغیر صرف اپنے حصے کے چھوٹے سے ٹکڑے کی بنا پر مایوسیاں اور غلط فہمیاں پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ویسے جی مانے تو سیاسی واقعات کی تفہیم کرتے ہوئے، کوئی فیصلہ سنا دینے سے پہلے بھی یہی طریقہ آزما لیا کریں۔ کوئی چاہے تو حالیہ لانگ مارچ یا آزادی مارچ کے حوالے سے بھی یہی طریقہ آزما لے، انشاءاللہ ناکامی نہیں ہوگی۔

شمائلہ عثمان

لافانی جنت

''واہ یہ جگہ تو بالکل جنت ہے''، یہ شہر کے اعلیٰ اور مہنگے بوفے ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کے بعد منہ سے نکلنے والا پہلا جملہ تھا۔ باہر کی گرمی کافور ہو چکی تھی۔ ٹھنڈے ماحول میں ہلکی ہلکی موسیقی ماحول کو سحر انگیز بنا رہی تھی۔ شدید بھوک میں کھانے کی خوشبو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ دوسرے ہال میں انواع واقسام کے کھانے، ان گنت میٹھے، موسم کا ہر پھل، ہر سبزی مختلف روپ اور ذائقوں کے ساتھ، جتنا چاہو کھاؤ۔ ایک ٹائم لمٹ میں کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہ تو واقعی جنت کا نظارہ ہے۔ ایک گھنٹہ تک ڈٹ کر کھایا پیا، ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے، لیکن یہ کیا؟ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہی ماحول میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ طبیعت سیر ہو جانے کی وجہ سے آنے والی کھانے کی خوشبو طبیعت کو بوجھل کر رہی تھی۔ باہر کی کھلی فضا میں کچھ طبیعت بحال ہوئی، لیکن نئے آنے والوں کیلئے یہ جنت کا ہی منظر تھا۔ لیکن بہت تھوڑے ٹائم کے لیے اور مخصوص طبقے کے لیے جو اس کے مقررہ دام ادا کر سکیں۔ دنیا کی یہ محدود نعمتیں، محدود لوگوں، کے لیے محدود وقت تک ہیں۔ پھر ان سب کا حساب کتاب ہونا ہے۔

کیا اللہ کی بنائی ہوئی جنت سے کسی کا دل بھر سکتا ہے؟ وہاں کے ادنیٰ سے ادنیٰ مقام سے بھی کوئی نکلنا چاہے گا؟ وہاں کی نعمتیں اور لذتیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہوں گی۔ نہ وہاں پہنچنے کے بعد اس کی کوئی قیمت چکانی پڑے گی۔ نہ حساب کتاب دینا ہوگا۔ نہ اس کے ختم ہونے یا چھن جانے کا خوف ہوگا۔ وہاں کی نعمتیں رب العزت کا خاص تحفہ ہوں گی۔ داہنے ہاتھ والوں کے لیے۔ اور رب کی عنایت ہر کمی اور عیب سے پاک ہوگی۔ جنت کی لافانی زندگی کا تصور جتنا بھی زیادہ سے زیادہ کر لیں وہ اس سے لاکھوں گناہ بڑھ کر ہوگی۔ اس جنت کا راستہ اس فانی زندگی سے ہی گزر کر نکلتا ہے جو بالکل سیدھا اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس راہ کی تفصیل قرآن پاک اور رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم زندگی ہے۔ آئیے مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور ہمیشہ حاصل ہونے والی جنت کے طلبگار بن جائیں۔

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

ہم جنس پرستی

[پچھلے ماہ ملاقات کے کالم میں ابو یحییٰ صاحب کا ہم جنس پرستی کے موضوع پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔اس کا آخری حصہ ذیل میں پیش خدمت ہے۔ادارہ]

مذہبی استدلال: ''قطع سبیل''

مذہب اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم جنس تعلق ایک بہت بڑا جرم اور فطرت کے خلاف ایک جنگ ہے۔قران مجید اسے قوم لوط ہی کے حوالے سے ''قطع سبیل''یعنی فطرت کی راہ کاٹنے (العنکبوت29:29) سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ کس طرح فطرت کی راہ کاٹتا ہےاس کے لیے انسانی سماج کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

انسانی سماج ایک اجتماعیت پسند سماج ہے۔ یہ اجتماعیت تعلقات سے وجود میں آتی ہے۔ تعلقات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا عارضی تعلق جو بہت بڑے دائرے میں پھیلا ہوا ہےاور کم وبیش پورے سماج کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تعلق ضرورت، مفاد، ذوق،نظریات اور جذبات واحسات وغیرہ کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔دکاندار اور گاہک کا تعلق ضرورت کا ہے۔ باس اور ملازم کا تعلق مفاد کا ہے۔دوستی ذوق اور مزاج سے پھوٹی ہے۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں لوگ نظریات کی بنیاد پر ایک تعلق پیدا کرتے ہیں۔کسی انسان سے محبت کا تعلق جذبات واحساسات کی پیداوار ہوتا ہے۔

انسانی سماج انھی عارضی تعلقات سے عبارت ہے۔مگران تعلقات کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے ضرورت، مفاد، ذوق،نظریات اور جذبات کسی وقت بھی بدل سکتے ہیں۔جس کے نتیجے

میں تعلق ختم ہو جاتا یا کسی اور کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ ضرورت اور مفاد کو تو چھوڑیے لوگ ذوق، نظریہ اور جذباتی تعلق کو بھی ایسے بھولتے ہیں کہ کبھی یاد نہیں آتا۔

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے

اب دل سے نام محو بھی اکثر کے ہو گئے

جبکہ انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک نفسیاتی وجود ہے۔ اسے اپنی تشکیل، تربیت اور تکمیل کے لیے کوئی ایسا تعلق چاہیے جو مستقل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مرد و عورت کے جنسی تعلق کو بنیاد بنایا ہے۔ اس تعلق کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس سے انسان وجود میں آتے ہیں۔ دنیا میں کوئی اور تعلق انسانوں کو وجود میں نہیں لاسکتا۔ ظاہر ہے کہ نسل انسانی کا باقی رہنا انسانیت کا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ ہے۔ مرد عورت کا جنسی تعلق سب سے پہلے اسی بنیادی انسانی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

اس تعلق کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سے وہ رشتے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے مستقل ہوتے ہیں۔ پیدا ہونے والے بچے کی ماں اور اس کا باپ بہر حال اس کی موت تک ایک ہی رہتا ہے۔ یہی حیثیت بہن، بھائی اور دیگر تمام رشتہ داروں کی ہے کہ ان سے تعلق مستقل ہوتا ہے۔ یہی وہ رشتے ہیں جو بچپن کے عجز، بڑھاپے کے ضعف، بیماری کی مشقت محتاجی کی ضرورت میں فطری طور پر ہمیشہ اور ہر حال میں انسان کی مدد کو آتے ہیں۔

یہی قریبی رشتے ہیں جو اپنا وقت، محنت، پیسہ قربان کر کے انسان کے بچپن کی ناتوانی کو جوانی کی قوت دیتے ہیں۔ پھر یہی وہ رشتے ہیں جو ہر سرد و گرم میں انسان کا ذہنی، نفسیاتی، مالی اور جسمانی طور پر ساتھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑھاپے کی ناتوانی کو اپنے بازوؤں سے سہارا دیتے اور موت کے بعد اپنے کندھوں پر اٹھا کر آخری سفر پر روانہ کرتے ہیں۔

ہم جنس پرستی اصل میں انھی بنیادی انسانی رشتوں کی جو مرد وعورت کے جنسی تعلق سے پیدا ہوتے ہیں، جڑ کاٹ دیتی ہے۔ ایک ہم جنس پرست جوڑا کبھی اولاد جنم نہیں دے سکتا۔ یہ کام صرف میاں بیوی کر سکتے ہیں۔ پانچ سات سال بعد میاں بیوی کا دل اگر ایک دوسرے سے بھر بھی جائے تب بھی وہ اولاد کی خاطر ساتھ رہتے اور ان کی پرورش کی ساری ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں۔ جبکہ ہم جنس پرستی کوئی رشتہ نہیں بس ایک عارضی تعلق ہے۔ جس روز دل بھرا، ذوق بدلا، جذبہ ٹھنڈا ہوا، احساس ختم ہوا، یہ تعلق ختم۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ نئے ہم مشرب کی تلاش۔ مگر جنس کا جذبہ تو زیادہ وقت نہیں گزرے گا ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اس کے بعد تلاش کس بنیاد پر ہو گی؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہم جنس پرستی کے کسی حامی کے پاس نہیں ہے۔

انسانوں کے ساتھ ظلم

ہم جنس پرستی دراصل خاندان کے خاتمے کا نام ہے۔ خاندان ایک مرد وعورت کے جنسی تعلق کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنسی تعلق میں اس قدر طاقت ہی اس لیے رکھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے انسانوں کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اولاد کو جنم دیں اور پھر اس کا بوجھ اٹھائیں۔ مگر بدقسمتی سے مغرب کی جنسی آزادی کے تصور نے خاندان کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ مرد وعورت کا تعلق جو صرف جنسی کشش کی بنیاد پر قائم ہو وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ یہ بار بار ٹوٹتا ہے۔ ایسے میں کہیں اولاد ہو جائے تو سب سے زیادہ اسی کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔

اولاد کا مقدر یہی ہوتا ہے کہ ماں کہیں ہو اور باپ کہیں اور۔ یوں بچہ ماں یا باپ یا بعض اوقات دونوں کے لمس اور تربیت سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہم جنس پرست جوڑے یہ ستم ایک اور طرح ڈھاتے ہیں۔ وہ اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے بچہ گود لے لیتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسے ماں کے لطیف لمس سے کون روشناس کرائے گا۔ اگر جوڑا خواتین کا ہے تو باپ کی

نگہبانی کا احساس کون دلائے گا۔ایک دوسرے سے دل بھر گیا تو لے پالک اولاد کا کیا ہوگا۔

چنانچہ ایسے تمام بچے شدید قسم کے نفسیاتی مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔لیکن مغرب میں یہ سسٹم برا بھلا اس لیے چل رہا ہے کہ وہاں بچوں کی معاشی ذمہ داری اور اسی طرح بزرگوں کی ذمہ داری بھی اسٹیٹ نے لے رکھی ہے۔ معاشی فراخی کی بنا پر آج یہ ان کے لیے کرنا آسان ہے۔مگر جب کبھی معاشی زوال آیا تو پھر خاندان کے سوا انسان کی جائے پناہ کوئی نہیں رہے گی۔ یہ صرف خاندان ہوتا ہے جو ہر طرح کے حالات اور ماحول میں ہزاروں برس سے کمزور بچوں اور ناتواں بوڑھوں اور غریب و پریشان حال رشتہ داروں کو سنبھالتا آیا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل واضح ہے کہ ہم جنس پرستی تعلق نسل انسانی اور خاندان دونوں کی جڑ کاٹ ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی کو قرآن مجید ''قطع سبیل''یعنی فطرت کی راہ مارنے سے تعبیر کرتا ہے۔

پاکستان اور ہم جنس پرستی

دنیا بھر کی طرح پاکستان میں بھی ہم جنس پرستی کے رجحانات عام ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ سرتا سر ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ زیادہ تر بچوں کی ابتدائی تربیت کی خرابی، غلط ماحول اور بعض اوقات والدین کی بے توجہی اور بے رحمانہ سلوک پیدا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں جس طرح کے حالات ہیں، والدین بچوں کی تربیت سے جس طرح بے پروا ہیں، بچوں پر تشدد عام ہے، اس میں دیگر نفسیاتی انحرافات کی طرح ہم جنس پرستی کے پھیلنے کے بڑے روشن امکانات ہیں۔اس پر مزید مغربی اور انڈین میڈیا نیز انٹرنیٹ سے جنسی بے راہ روی کی پیہم یلغار ہے۔اور اب اس سے آگے بڑھ کر ہم جنس پرستی کے حق میں کیے گئے پروپیگنڈے کا انٹرنیٹ کے ذریعے سے با آسانی پہنچنا ایک بڑا مسئلہ ہے۔جس میں متاثرہ شخص اس مسئلے کو نفسیاتی مسئلہ سمجھنے کے بجائے اپنی فطرت سمجھنے لگتا ہے۔

اب یہ بات معلوم ہے کہ پاکستانی نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں یہ مسئلہ بہت پھیل رہا ہے۔ ایسے میں یہ ضروری ہے کہ والدین اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیں۔ بچوں کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ تشدد اور بے اعتنائی سے پرہیز کریں۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ بچپن اور نوعمری میں بچے کے جنسی رجحانات اپنا ظہور کرتے ہیں۔ اس میں وہ مرد و زن کی تمیز نہیں کرتے۔ کہیں کوئی انحراف محسوس ہو تو یہ واضح کر دیں کہ محبت اور جنسی تعلق اصل میں ہمیشہ صنف مخالف کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ یہی فطرت ہے۔

ایسا کوئی انحراف سامنے آئے تو نفرت اور غصہ کے بجائے ہمدردی کے ساتھ مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ پختہ عمر کے عیش پرستوں کو چھوڑ کر نوعمر بچوں کے لیے یہ دراصل ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں مذہب کی رہنمائی کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید نے چونکہ قوم لوط کے حوالے سے اس معاملے میں اللہ رب العزت کی منشا، مزاج اور مرضی کو پوری طرح واضح کیا ہے۔ اس لیے بچوں کو اس حوالے سے ایجوکیٹ کرنا چاہیے۔ یہ سب سے بڑھ کر والدین کی ذمہ داری ہے۔

بہرحال اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جنسی تعلق قطعاً ایک غیر فطری تعلق ہے۔ یہ تعلق اگر فروغ پائے گا تو سماج کی جڑ کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں درست شعور کو عام کریں اور دین کی تعلیم صحیح پس منظر میں دیں۔

اس دنیا میں کامیابی کسی اتفاق کا نام نہیں
کامیابی اپنے امکانات کو سمجھنے اور

پروفیسر محمد عقیل

فحاشی اور اسلامی تعلیمات

(آخری قسط)

احادیث میں فحاشی کی مذمت

❁ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے آپ کے بارے میں بیان ہوتا ہے:

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گو اور فحش کام کرنے والے نہیں تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب لوگوں میں مجھ کو وہ شخص زیادہ پسند ہے جو تم میں سب سے زیادہ خوش خلق ہو۔'' (صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر 996)

❁ ایک اور حدیث میں بیان ہوتا ہے:

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ سے بڑھ کر کسی کو اپنی تعریف و مدح پسند نہیں ہے اسی وجہ سے اللہ نے خود اپنی تعریف بیان کی ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں ہے اسی وجہ سے فحاشی کے کاموں کو حرام کیا ہے۔'' (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 2490)

❁ ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حیاء ایمان کا حصہ ہے اور ایمان جنت میں لے جاتا ہے۔ فحاشی ظلم ہے اور ظلم جہنم میں لے جاتا ہے۔'' (جامع ترمذی: جلد اول: حدیث نمبر 2097)

❁ ''عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ

سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے اور اللہ سے زیادہ کسی کو تعریف پسند نہیں ہے۔" (صحیح بخاری: جلد سوم: حدیث نمبر 2301)

❁ بے حیائی کو ایک اور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے

"ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ والوں کی دو قسمیں ایسی ہیں کہ جنہیں میں نے نہیں دیکھا ایک قسم ۔۔۔۔ان عورتوں کی ہے جو لباس پہننے کے باوجود ننگی ہیں وہ سیدھے راستے سے بہکانے والی اور خود بھی بھٹکی ہوئی ہیں ان عورتوں کے سر بختی اونٹوں کی طرح ایک طرف جھکے ہوئے ہیں وہ عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ ہی جنت کی خوشبو پا سکیں گی جنت کی خوشبو اتنی اتنی مسافت (یعنی دور) سے محسوس کی جا سکتی ہے۔" (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 1085)

اس حدیث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اس میں صرف خواتین کی مذمت کی گئی ہے۔ دراصل یہ حدیث اس رویئے کی مذمت میں آئی ہے جو جنس مخالف کو زنا کی جانب اکسانے کے لئے اپنایا جائے۔اس میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ یہ وہ اوباش اور آوارہ عورتیں ہیں جو خود بھی بھٹکی ہوئی ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکانے کا باعث بنتی ہیں۔ یہی رویہ اگر مردوں میں پایا جائے تو قابل مذمت ہے۔مثال کے طور پر کوئی آوارہ لڑکا عورتوں کو بہکائے، انہیں اپنے لباس، چکنی چپڑی باتوں، اپنی پرکشش شخصیت یا اپنے دولت کے جھانسے میں لے کر ان کو غلط کام پر اکسائے یا ورغلائے تو وہ بھی اس حدیث کی وعید میں آئے گا اور وہ بھی جنت میں داخل ہو پائے گا اور نہ ہی اس کی خوشبو پا سکے گا۔

❁ یہاں صرف عورتوں ہی پر قدغن نہیں لگائی ہے بلکہ مردوں کو بھی کچھ اقدام کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ حدیث میں بیان ہوتا ہے:

''حضرت عقبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتوں کے پاس (تنہائی میں) جانے سے بچو انصار میں سے ایک آدمی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیور کے بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیور تو (تنہائی میں) موت ہے۔'' (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 1177)۔

- نامحرم عورت کو چھونے میں اس قدر احتیاط رکھی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کسی نامحرم عورت کو نہیں چھوا۔

''حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے عورتوں کی بیعت کی کیفیت کی خبر دی کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی عورت کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوا ہاں جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لیتے اور عورت (زبانی) عہد کر لیتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (زبان سے) فرما دیتے جاؤ میں نے تجھے بیعت کر لیا۔'' (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 338)

- آخر میں ایک اہم بشارت اس ضمن میں بیان کی گئی ہے:

''سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن سعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو شخص اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان کی چیز (زبان) اور دونوں ٹانگوں کے درمیان کی چیز (یعنی شرمگاہ) کا ضامن ہو تو اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں'' (صحیح بخاری: جلد سوم: حدیث نمبر 1395)۔

فحاشی کی تعریف

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فحاشی کیا ہے:

’’فحاشی سے مراد ہر وہ عمل ہے جو ناجائز جنسی لذت کے حصول کے لئے کیا جائے یا جس کے ذریعے جنسی اعضاء یا فعل کی اس نیت سے اشاعت کی جائے کہ جنسی اشتہا بھڑکے یا جنسی تسکین حاصل ہو۔‘‘

وضاحت

زنا و اغلام بازی تو واضح طور پر ایک فحش عمل ہے۔ البتہ وہ امور جو زنا سے قریب کرنے کا ذریعہ ہوں وہ بھی فحاشی ہی ہیں۔ چنانچہ شرعی اجازت کے بغیر بوس و کنار کرنا، نگاہوں کا جنسی مناظر دیکھنا، کانوں کا بے حیائی کی باتیں یا فحش موسیقی سننا، ہاتھوں کا جنسی لذت حاصل کرنا، زبان کا فحش گوئی میں ملوث ہونا اور دماغ کا فحش سوچوں میں غلطاں ہونا اسی لحاظ سے فحش فعل کے زمرے میں آتا ہے۔

قرآن میں فحاشی زنا کو کہا گیا ہے۔

’’اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کیونکہ وہ فحاشی اور برا راستہ ہے۔‘‘ (بنی اسرائیل 32:17)

حدیث میں بیان ہوتا ہے:

’’حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ابن آدم پر اس کے زنا سے حصہ لکھ دیا گیا ہے وہ لامحالہ اسے ملے گا پس آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور کانوں کا زنا سننا ہے اور زبان کا زنا گفتگو کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چلنا ہے اور دل کا گناہ کی خواہش اور تمنا کرنا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب۔‘‘ (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 2253)

فحش مواد

’’فحش مواد سے مراد وہ تحریر، تصویر، وڈیو، موسیقی، بات چیت، اشارہ، لطیفہ، عریانی یا کوئی اور

طریقہ جس میں جنسی اعضاء یا فعل کو اس نیت سے دکھایا یا بیان کیا جائے کہ جنسی اشتہا بھڑکے یا جنسی تسکین حاصل ہو۔''

مواد کے فحش ہونے کے لوازمات

کسی بھی مواد کے فحش ہونے کے لئے درج ذیل باتوں کا ہونا ضروری ہے:

- شرعی تعلق کے بغیر جنسی اعضا یا فعل کو دکھایا جائے یا بیان کیا جائے۔
- نیت جنسی اشتہا کے بھڑکانے یا جنسی تسکین کی ہو۔ چنانچہ میڈیکل، قانونی یا کسی اور جائز مقصد کے تحت لٹریچر کی اشاعت فحش نہیں قرار پائے گی۔

محمد سفیر الاسلام

صفائی اور طہارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ پاک ہے اور نظافت وصفائی کو پسند کرتا ہے' وہ کریم ہے کرم کو پسند کرتا ہے' جواد ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے پس تم اپنے آپ کو صاف رکھو اور یہودیوں جیسے نہ بنو''۔(ترمذی)

مسلمان کا اپنے آپ' اپنے گھر اور گھر کے دائرے میں امتیاز اس کی نظافت (صفائی) ہے' نظافت کے اہتمام میں غیر مسلم بھی مسلمان کے ساتھ شریک ہوسکتا ہے۔لیکن مسلمان طہارت کی وجہ سے اور زیادہ ممتاز ہوتا ہے۔طہارت حکم شرعی ہے جو بعض اسباب کے ساتھ مربوط ہے کبھی اس کے لیے نظافت ضروری ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔مثلاً الکوحل نظیف تو ہوسکتی ہے مگر وہ پاک و مطہر نہیں ہوتی' اس لیے طہارت اور نظافت میں بہت بڑا فرق ہے' مسلمان ایک وقت میں نظافت وطہارت دونوں کا حامل ہوتا ہے۔یہی چیز انسانوں کی اصناف میں اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ گندگی اور نجاست سے دور بھاگتا ہے۔ چاہے یہ حقیقی ہو یا غیر حقیقی۔ایک مسلمان نظافت کے ساتھ اس بات کا بھی پورا اہتمام کرتا ہے کہ اس کا جسم پاک ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وضو کی حفاظت مومن کے سوائے کوئی نہیں کرتا''۔(احمد'ابن ماجہ)

بدن کے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ مومن لباس کی پاکی کا بھی حریص ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک مومن بدن ولباس کے ساتھ ساتھ گھر کی طہارت ونظافت کا بھی متمنی ہوتا ہے۔وہ گھر اور اسمیں موجود سامان کی طہارت ونظافت کا پورا اہتمام کرتا ہے' پھر مزید یہ کہ وہ گھر میں جہاں نماز پڑھتا ہے اس مقام کی پاکیزگی کا زیادہ اہتمام کرتا ہے۔وہ گھر میں گندگی اور کوڑا کرکٹ

نہیں پھیلنے دیتا۔ باتھ روم اور باورچی خانہ تو خاص توجہ طلب ہوتے ہیں جن پر مومن کی نظر رہتی ہے۔ گرد وغبار کو جھاڑا جاتا ہے' گویا گھر میں کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کرتا جو گھر کو بدنما بنا رہی ہو۔

اس سلسلے میں وہ ان امور کو مدنظر رکھتا ہے:

☆ اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ استعمال شدہ اشیا میں جو بے کار ہو گئی ہیں ان کو کوڑا دان میں ڈالا جائے۔ خاص طور پر باتھ روم میں استعمال ہونے والا ٹشو وہاں پر موجود کوڑا دان میں پھینکا جائے نا کہ ادھر ادھر پھینکا جائے' باورچی خانے کا کچرا بھی ادھر ادھر نہ پھیلنے دیا جائے اور اس کو مخصوص مقام پر رکھی ہوئی ٹوکری میں ڈالا جائے یہ ٹوکری ڈھکی ہوئی ہونا چاہیے تا کہ بچے اس میں سے کوئی چیز نکال کر کھانا شروع نہ کر دیں' اس ٹوکری کو صاف اور خالی کرتے رہنا چاہیے۔

☆ گھر کے تمام افراد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جن چیزوں پر گرد پڑ گئی ہو ان کی صفائی اور جھاڑ پونچھ کر دیں۔

☆ گھر میں جھاڑو لگانے کا وقت مقرر ہونا چاہیے۔

☆ گھر میں رہنے والے لوگوں کو ممکن ہو تو ہر روز ورنہ ہر ہفتے میں ایک بار غسل ضرور کرنا چاہیے ویسے جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے۔ دانتوں اور مسوڑھوں کی صفائی کے لیے مسواک کا اہتمام کیا جائے ٹوتھ پیسٹ اور برش بھی کیا جا سکتا ہے۔

☆ برآمدے اور صحن کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھا جائے اسی طرح بیت الخلا اور باورچی خانے کی صفائی تو خوب توجہ مانگتی ہے اور کہا جاتا ہے کسی خاندان کی صفائی پسندی کا اندازہ اس کے بیت الخلا اور باورچی خانے کی صفائی سے کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات گھر کے کسی ایک فرد کو یہ وسوسہ پڑ جاتا ہے کہ اس نے نظافت وطہارت حاصل کی یا نہیں۔ وہ اس میں افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ وسوسہ اسراف کی طرف لے جاتا ہے' اس لیے اس کا علاج ضروری ہے۔ اس میں مالکیہ کے نزدیک رخصت یہ ہے کہ اگرچہ پانی تھوڑا ہی کیوں نہ ہو اگر اس میں نجاست گر جائے اور اس کے رنگ' ذائقے اور بو میں تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو تو وہ پاک ہے' مذہب حنفیہ میں یہ رخصت ہے کہ جائے نماز اگر زمین سے چپکی ہوئی ہے تو اس کا حکم زمین کا ہے' اس پر نجاست خشک ہو جائے اور اس کا اثر محسوس نہ ہو تو وہ پاک ہے' امام ابوحنیفہ کے مذہب میں یہ رخصت بھی ہے کہ اگر لباس یا کسی جگہ پر نجاست لگ جائے لیکن اس مقام کا تعین نہ ہو رہا ہو تو جہاں غالب گمان ہو اس جگہ یا حصے کا دھو لینا اسے پاک کر دیتا ہے۔ آپ کے مسلک میں یہ بھی موجود ہے کہ جائے نماز یا بوریے پر اگر نجاست لگ گئی ہو اور خشک ہو گئی ہو یا کسی کے پاؤں پر پیشاب لگا ہو لیکن نجاست پاؤں پر نظر آ رہی ہو تو پھر یہ جائے نماز یا بوریے کو ناپاک نہیں ہو گی۔ مذہب امام شافعی کے نزدیک یہ رخصت ہے کہ اگر نجاست جذب یا خشک ہو گئی ہو تو اس پر پانی بہا دیا جائے یوں نجاست طہارت میں بدل جائے گی اور پانی پاک رہے گا۔ اس مسئلے کے فروع بہت زیادہ ہیں۔ اگر مذکورہ صورت ہو تو اس پر پانی بہا دینے سے یہ پاک ہو جائے گی۔ پانی جسم اور لباس پر بہا دینے سے طہارت حاصل ہو جائے گی۔ یہ تو وسوسے کے شکار کی بات تھی مگر متساہل کے لیے ضروری ہے کہ وہ عملی طور پر نظافت اور طہارت کا اہتمام کرے۔

[نوٹ یہ سلسلہ مضامین سعید حویٰ کی تصنیف ''البیت المسلم '' کی تلخیص وترجمہ پر مشتمل ہے۔]

فرح رضوان

بچے ہمارے عہد کے (3)

غیر محفوظ حالات میں حفاظت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنی زندگیوں میں سے بہت سی تفریح، بہت سے راستے، بہت سے شوق تلف کر دیے ہیں۔ مگر پھر بھی، ایک بہت ہی ہلاکت خیز مواد عموماً ہمارے ساتھ چلتا اور پلتا، پھلتا اور پھولتا چلا آ رہا ہوتا ہے۔ اور عموما ہم اس سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ وہ ہے معاشرے میں تیزی سے پروان چڑھتی ہوئی شو آف یا ریاکاری کی عادت، یہ دونوں ہی عادات آخرت کی خرابی کا سامان تو ہیں ہی ساتھ ہی دنیا کے لیے بھی انتہائی مہلک ہیں۔ یہاں ہم والدین ہر غلطی کا الزام آج کل کے بچوں پر تھوپ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔

اور دیانت داری سے اگر اپنا احتساب کریں تو قصور تو سارا کا سارا ہمارا ہی نکلتا ہے، ننھے سے بچے کو کیا خبر ہوتی ہے کہ وہ جب پیدا ہوا تو اس کو کس برانڈ کے کپڑے پہنائے جاتے تھے، کس برانڈ کے برتنوں میں وہ کھاتا پیتا تھا، کس پنگوڑے میں جھولتا تھا اور کس مونٹیسری سے اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہ تو ہم اسے بعد میں تصویروں، قصوں اور ویڈیوز کی مدد سے باور کرواتے ہیں تاکہ وہ خود کو بااعتماد محسوس کرے۔

اگر کبھی آپ احتساب کا ارادہ کر ہی بیٹھیں تو والدین کی ان تین اقسام میں سے آپ خود کو کس ٹائپ میں پاتے ہیں؟

ا۔ وہ والدین جن کو اللہ تعالیٰ نے بے حساب دیا ہے اور اعلیٰ ترین بلکہ منفرد اور انوکھی چیز سے کم کو ہاتھ لگانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

۲﴾ وہ والدین جو بہت کچھ پا لیتے ہیں لیکن سب کچھ نہ پانے کی وجہ سے کبھی نجی زندگی کے حالات کو روتے ہیں کبھی معاشی حالات کو کبھی سیاسی حالات کو اور ہر وقت کسی نہ کسی سے نالاں، شاکی، مشکوک، اور خود کو مظلوم و محروم سمجھتے ہوئے، اپنے احساس کمتری سے مبتلا لڑتے، بچوں میں اعتماد بحال کرتے زندگی گزار دیتے ہیں۔

۳﴾ وہ والدین جن کا ہاتھ اتنا کھلا نہیں ہوتا لیکن اولاد کو بہترین سہولیات فراہم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، محنت اور حکمت سے اخراجات کو کنٹرول کرتے ہیں، او چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں، جو مل جائے اس پر شکر اور نہ ملنے پر صبر سے کام لیتے ہیں۔

سو فیصد نہ سہی لیکن اکثر، پہلی قسم کے والدین کی اولاد کو محض دکھاوا ہی نہیں، رعونت بھی ورثے میں ہی ملتی ہے۔

اور اس میں تو کوئی دو رائے نہیں ہونی چاہیے کہ ہم میں سے اکثریت نے اپنے آپ کو والدین کی تیسری ٹائپ میں ڈال کر خود کو کافی سرخرو قرار دے دیا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم میں سے بیشتر ٹائپ ۲ پر ہی فٹ آتے ہیں لیکن پہلی بات یہ کہ ہم جانتے ہی نہیں اور دوسری یہ کہ مانتے نہیں۔ شو آف کی ایک بہت ہی بنیادی وجہ احساس کمتری ہوتی ہے۔

عموماً اسے احساس برتری سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے پیچھے بھی اپنی کسی خامی یا کوتاہی کو چھپانا ہی ہوتا ہے، جس کی وجہ سے لوگ یا تو پرائس ٹیگ کا کام کرتے ہیں کہ فلاں کام اتنے کا کروایا فلاں چیز اتنے کی آئی، یا پھر وہ از خود برانڈ ایمبسڈر بن جاتے ہیں ابھی آپ نے از راہ اخلاق کسی چیز کو سراہا نہیں کہ آپ کو لگ پتہ جائے گا کہ کس برانڈ کی چیز ہے، یا کپڑے ہیں یا بیوٹیشن ہے، یا کاسمیٹکس ہیں، یا کار ہے، یا فون ہے، یا کھانا ہے یا برتن ہیں، یا جوتے ہیں......اور جب والدین کا یہ عیب یا روحانی مرض بچوں میں انتقال کرتا ہے تو دو چند اور سہہ آتشہ ہو جاتا ہے۔

تب معاشرہ اسی اخلاقی مرداری کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے جس سے آج ہم سب پریشان ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب وافر آمدنی والے (جانتے ہوئے یا انجانے میں) شو آف کریں گے تب متوسط اور کم آمدنی والے افراد اس کا اثر لیں گے اور اپنے بچوں کو اعتماد دینے کے نام پر کبھی کسی مفلس رشتے دار کا حق مارا جائے گا۔ کبھی کسی نادار ہمسائے کا۔ اور سب سے زیادہ ضرورت مند انسان خود کو تصور کرے گا۔

کم فہم افراد صدقہ تو کیا زکوٰۃ جیسے فرض سے بھی جائیں گے۔ ان سے بھی کم فہم افراد ہر سطح پر چوری رشوت دھوکہ اپنا حق سمجھیں گے۔ کیا ان تمام خرابیوں کا بیج ہم ہی نے نہیں بویا؟ برانڈز کے غلبے سے مغلوب ہو کر ان کو اپنا معبود بنا کر، ان کا ورد کر کر کے ان کے نام کی مالا جپ کر ان کی اعلی صفات بیان کر کر کے، خود ان کے سحر میں مبتلا ہو ہو کر، دوسروں کو کر کے، مہندی ہو تو ایسی ہو شادی ہو تو ایسی ہو، دلہن ہو تو ایسی ہو، جوڑا ہو تو ایسا ہو کس نے سکھایا ہے کس کی زبان و بیان سے، عمل سے یہ سب کچھ عام ہی نہی بلکہ واجب ہو گیا ہے؟

کس کی وجہ سے معاشرے میں سادگی سے شادی مشکل ترین اور اس قدر بے حیائی کے واقعات مسلسل بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں......؟

نہیں مان رہا نہ دل، خود پر اتنے سنگین الزمات لینے کو، ہمارا المیہ ہی یہی ہے کہ ہم غلطی تو کھلے عام کرتے ہیں لیکن غلط کبھی نہیں ہوتے، آپ فی الحال اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں ریا کاری پر بعد میں بات کرتے ہیں۔

[جاری ہے]

سوال و جواب

ابو یحییٰ

قیامت کی تمثیل

سوال: السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ میرا سوال بعث بعدالموت کی قرآنی دلیل سے متعلق ہے۔قرآن میں متعدد جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کی دلیل کے طور پر فرمایا ہے کہ مردہ زمین کو دیکھو کیسے ہم اس کو بارش بھیج کر زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح دوبارہ جی اٹھنا ہوگا- یہ دلیل میری سمجھ میں نہیں آ رہی، میرے ذہن میں درج ذیل پوائنٹس ہیں۔

☆ مردہ زمین نہیں نباتات ہوتے ہیں-

☆ مردہ نباتات تو دوبارہ زندہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے بیج پھوٹ پڑتے ہیں، یعنی ان کی اگلی نسل وجود پذیر ہوتی ہے نہ کہ وہی مردہ پودے۔

☆ اس دلیل سے زیادہ قوی دلیل مجھے موسم خزاں میں درختوں کے پتوں کا جھڑ جانا لگتا ہے، یعنی اس حالت میں یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ درخت ایک بار پھر موسم بہار آنے پر " زندہ " ہو جائے گا- مجھے اپنی علمی رائے سے آگاہ فرما کر میری ذہنی الجھن دور فرما دیجیے۔ جزاک اللہ خیر۔ عرفان رشید

جواب: وعلیکم السلام رحمۃ اللہ و برکاتہ۔اس طرح کی تشبیہات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پس منظر کو سمجھا جائے جس میں یہ بات بیان کی جا رہی ہے۔

دیکھیے یہ بات پاکستان جیسے ملک کے پس منظر میں نہیں کہی جا رہی جہاں نہری پانی سے فصلیں کاشت ہوتی ہیں۔ پہلے زمین ہموار ہوتی ہے پھر بیج بوئے جاتے ہیں اور پھر کہیں جا کر فصل آتی ہے۔ بلکہ یہ بارانی زمین کے پس منظر میں بات کی گئی ہے۔ بارانی زمین میں آپ کتنے

ہی بیج ڈالدیں اگر بارش نہیں ہوگی تو کوئی سبرہ نہیں لہلائے گا۔مگر جب بارش شروع ہوجاتی ہے تو خوبخود وہ جگہ سرسبز ہوجاتی ہے۔ جب بارش کا موسم ختم ہوجاتا ہے تو وہ جگہ دوبارہ خشک اور بنجر ہوجاتی ہے۔اسی حقیقت کوقرآن نے زمین کے زندہ اورمردہ ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک ادبی اسلوب ہےاورادب میں چیزیں ایسے ہی بیان ہوتی ہیں یعنی بارہا ظرف بول کرمظروف مرادلیاجاتا ہے۔یعنی یہاں زمین بول کرسبزہ ہی مراد ہے۔

انسانوں کو چونکہ قبروں مین دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کا نام ونشان بھی کچھ عرصہ میں مٹ جاتا ہے چنانچہ اسی پس منظر میں یہ دلیل دی گئی ہے کہ جس طرح آسمان کے برسنے کے بعدمردہ زمین سے سبزہ پھوٹ جاتا ہے اسی طرح ایک روز آسمانی حکم سے یہ مردہ زمین اپنے اندر دفن سارے انسانوں کواسی طرح باہراٹھا کھڑا کرے گی جس طرح سارا سال خشک وبےنشان سبزہ موسم برسات میں پھوٹ پڑتا ہے۔

قرآن مجیداس طرح کے دلائل تمثیلی اسلوب میں بیان کرتا ہے۔تمثیل میں ضروری نہیں ہوتا ہے کہ اصل حقیقت اورتمثیل کے درمیان ہرہر جز میں مکمل اتفاق پایا جائے۔ بلکہ مجموعی طور پرایک منظرکشی پیش نظر ہوتی ہے۔وہاں سوال یہ تھا کہ انسان جومرکرمٹی ہوجاتا ہے انھیں کون جی اٹھائے گا۔جواب دیا گیا کہ اس زمین کودیکھو جس کو ہر برس ہم زندہ کردیتے ہیں۔وہی سبزہ ہوتا ہے جو بارش میں نمودار ہوجاتا ہے اور پھرختم ہوجاتا ہے۔نہ کوئی بیج ڈالا جاتا ہے نہ اگلی نسل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل عرب جس صحرائی ماحول میں رہتے اورجس اعلیٰ عربی زبان کو بولتے تھےاس میں یہ دلیل اور یہ طرز کلام بہت موثر تھا۔

باقی جومثالیں آپ نے دی ہیں وہ یقیناً درست ہیں،مگر یہ عربوں کودی جاتیں تو بہت موثر نہ ہوتیں۔وہاں نہ درخت ہوتے ہیں نہ موسم خزاں ہوتا ہے۔نہ بیج بوکرفصلیں اگائی جاتیں تھیں اور

نہ ’’وادی غیر ذی زرع‘‘ میں سارا برس کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ ہاں آج کے لوگوں کو سمجھانے کے لیے آپ اللہ تعالیٰ کی اس بات کی شرح میں یہ مثالیں پیش کر سکتے ہیں مگر قرآن نے اپنے اولیں مخاطبین کو سامنے رکھ کر کلام کیا ہے۔ اور وہاں وہ بالکل درست بھی ہے اور موثر بھی۔

ہندوستان اور امریکہ میں نبیوں کی بعثت

سوال: السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ ہندوستان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کئی ہزار سال سے انسانوں کا مسکن رہا ہے۔ مگر قرآن یا دیگر صحائف سے یہاں کسی نبی کی آمد کا سراغ نہیں ملتا۔ یہی معاملہ امریکا وغیرہ کا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسانوں کی طرف پیغمبر نہیں بھیجے؟ یا ہم ان سے لاعلم ہیں؟ پلیز وضاحت فرمادیں، سجاد نواز۔

جواب: وعلیکم السلام رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کی طرف انبیاء بھیجے ہیں اور ہدایت کو تمام لوگوں تک براہ راست پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ سورۃ الرعد (7:13) میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کی ہے کہ ہر قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہوتا ہے۔

یہ آپ کے سوال کا اصولی جواب ہے۔ رہا یہ سوال کہ ہندوستان یا امریکہ میں کسی نبی کی آمد کا سراغ نہیں ملتا تو یہ بات ٹھیک ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہاں نبی نہیں بھیجے گئے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان انبیا کے قصے بیان ہوئے ہیں جن سے اس کے اولین مخاطبین یعنی بنی اسماعیل کے عرب اور یہود و نصاریٰ واقف تھے۔ یہی وہی انبیا ہیں جن کا ذکر ان کی روایات میں موجود تھا یا پھر ان کی کتابوں میں ان کے حالات تھے۔ اس کے علاوہ کسی اور نبی کا بیان قرآن مجید نے نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی اقوام کے لیے نبی نہیں تھے۔ اس کا جواب تو مذکورہ

بالا آیت نے دے دیا کہ ہر قوم کے لیے ہدایت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

شادی کے لیے لڑکیوں کو ناپسند کرنا

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بھائی آپ کے شادیوں سے متعلق کتابچے ''یہ نعمت مصیبت کیوں بن گئی ہے'' میں آپ نے لڑکیوں کی ریجکشن پر نہیں لکھا۔ حالانکہ آدھی سے زیادہ لڑکیاں خراب ہی بار بار ریجکٹ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں اور اس میں تو والدین کی بھی غلطی نہیں۔ کچھ تو اس سے اللہ کے قریب ہو جاتی ہیں، مگر اللہ کو اس کا قصوروار سمجھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے تو آپ اس پہ کوئی آرٹیکل لکھیں۔

عدیلہ کوکب

جواب: وعلیکم السلام رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

لڑکیوں کی ریجیکشن بڑی تکلیف دہ شے ہے۔ مگر یہ اس کتابچے کا موضوع نہ تھا۔ لڑکیوں کو بھی اسے ریجیکشن کے طور پر نہیں لینا چاہیے۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ یہ نصیب ہی میں نہیں تھا۔ یا اس میں اللہ کی طرف سے بہتری نہیں تھی۔ یہ اصل میں ریجیکشن ہوتی بھی نہیں ہے۔ بلکہ ترجیح یا ذوق اور حالات کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ ہر شخص کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی ترجیح اور ذوق کے لحاظ سے معاملہ کرے۔ اس پر برا نہیں ماننا چاہیے۔

البتہ یہ بہر حال دیکھنا چاہیے کہ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں اگر شکل و صورت بنیادی تقاضہ بن گئی ہے تو بہر حال اپنی گرومنگ پر توجہ دینا چاہیے۔ اس میں دینی اعتبار سے کوئی حرج نہیں۔ فیصلہ بہر حال اللہ کرتے ہیں، ان سے بھلائی مانگتے رہنا چاہیے۔

ابو یحییٰ

قرآن میں لونڈیاں بنانے کی ممانعت کیوں نہیں؟

محترم عثمان شیخ صاحب 17 ستمبر، 2014

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

محترم غلامی ایک فطری برائی ہے۔کوئی انسان اسے کبھی گوارانہیں کرسکتا۔ یہ اس قدر فطری برائی ہے کہ جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں وہ بھی کبھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ ان کی بہن ،بیٹی اور بیوی یا دیگر قریبی رشتہ دار خواتین کو لونڈیاں بنا کر دوسرے لوگ ان سے اپنی ہوس کی تسکین کریں۔اس لیے جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں میں ان سے پہلے سوال یہ کرتا ہوں کہ کیا وہ اپنی بہن بیٹیوں کے لیے بھی اس برائی کو جائز قرار دیں گے؟ کوئی طاقتور فرد یا گروہ یا غیر ملکی طاقت بالجبر ایسے لوگوں کی خواتین کو اٹھا کر لے جائے تو کیا وہ یہ کہہ کر خاموش بیٹھ جائیں گے کہ بھئی قرآن میں تو لونڈیوں کی ممانعت ہے نہیں۔اس لیے ہم اپنی خواتین کا لونڈی بن جانا قبول کر لیتے ہیں۔

اس لیے اس ناقابل تردید حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ لوگوں کو لونڈی غلام بنانا بدترین ظلم اور جبر ہے۔تاہم بدقسمتی سے تاریخ میں ایک زمانے میں یہ جبر رائج ہو گیا اور ہزاروں برس تک رائج رہا۔قرآن مجید نے اسی کی بتدریج اصلاح کی ہے۔اس کی تفصیل اور قرآن مجید اور سیرت سے ثبوت اگر آپ کو درکار ہیں تو مولانا امین احسن اصلاحی نے سورہ نور کی تفسیر میں آیہ مکاتبت کے تحت اس کی تفصیل کر دی ہے، جسے آپ ان کی تفسیر تدبر قرآن میں دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم لوگ قرآن کریم اور سیرت طیبہ کا گہرا فہم نہیں رکھتے نہ

اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ لونڈیاں ہمیشہ کمزوروں کی خواتین کو بنایا جاتا ہے۔اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا میں کمزور مسلمان ہیں۔ یہ قانون وحشت اگر دوبارہ لوٹا تو اصل خسارے میں مسلمان رہیں گے۔ ابو یحییٰ

محترم عثمان شیخ صاحب 20 ستمبر، 2014

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

دیکھیے قرآن مجید چیزوں کو حرام قرار دینے کے لیے دو طریقے اختیار کرتا ہے۔ایک یہ کہ کسی چیز کا نام لے کر ممنوع قرار دے دیا جائے۔جیسے قرآن مجید تجسس کی ممانعت کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ ولا تجسسوا (الحجرات 12:49)۔یعنی تم تجسس نہ کرو۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کی عمومی کیٹیگری کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔اس کیٹیگری کے ذیل میں آنے ولی تمام چیزیں خود ہی ممنوع ہو جاتی ہیں اور قرآن کریم میں ان کی ممانعت کا حکم تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔مثلاً ایک شخص یہ کہے کہ قرآن پاک میں سور کھانے کی تو ممانعت ہے البتہ سانپ کھانے کی نہیں ہے اس لیے سانپ کھانا جائز ہوگیا۔یہی معاملہ تمام درندوں اور بول و براز وغیرہ کا ہے۔آپ کو ان کی ممانعت کا براہ راست حکم قرآن مجید میں نہیں ملے گا۔

ایسی چیزوں کی حرمت میں جیسا کہ بیان ہوا کہ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ عمومی کیٹیگری بیان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اسی اصول پر خبائث کو حرام قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کے لیے صرف طیبات ہی حلال قرار دیے ہیں،(المائدہ 5:5)۔چنانچہ سانپ، شیر، چیتے اور بول و براز وغیرہ اس وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں کہ انسان ان کو فطری طور پر خبیث چیزوں کے طور پر جانتا ہے۔خیال رہے کہ استثنائی طور پر اگر کوئی واقعہ اس نوعیت کا

ہوجائے تو اس سے ان کی فطری حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

حرمت کی ایسی ہی ایک کیٹیگری وہ ہے جس میں قران بغی یا زیادتی کو ممنوع قرار دیتا ہے، (اعراف 33:7)۔ اب اس کے بعد ضروری نہیں رہتا کہ قرآن مجید ظلم کی ہر قسم کا نام لے کر یہ بیان کرے کہ فلاں زیادتی ناجائز ہے اور فلاں ظلم حرام ہے۔ بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے جس جس چیز پر ظلم کا اطلاق کرتے ہیں وہ خود بخود اسی اصول پر حرام ہوجائے گا۔ کسی انسان کی آزادی کو سلب کر کے اسے غلام بنالینا اسی نوعیت کی چیز ہے۔ چنانچہ غلامی اسی اصول پر حرام ہے کیونکہ اس میں لوگوں کی آزادی پر حملہ کر کے اور ان کی عزت اور آزادی پامال کر کے انھیں غلام بنایا جاتا ہے، بالجبر ان سے مشقت لی جاتی ہے اور دیگر طریقوں سے انھیں ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ غلامی ہر حال میں ایک برائی تھی اور اسے گوارا کرنا اسلام کے لیے کسی طور ممکن نہ تھا۔ مگر جیسا کہ بار بار بیان ہوتا ہے کہ یہ برائی اتنی زیادہ پھیل چکی تھی کہ نہ صرف اس کی برائی کا تاثر ختم ہو چکا تھا بلکہ پورا معاشرتی نظام اسی پر منحصر ہو چکا تھا اس لیے دین اسلام نے اس برائی کے خاتمے میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ برائی کو بھی غیر فطری طریقے پر ختم نہیں کرتا۔

چنانچہ جو لوگ آج غلامی اور خاص کر خواتین کو لونڈی بنا کر ان سے استفادہ کے قائل ہیں اور اس کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں غلامی کے خاتمے کا کوئی حکم نہیں وہ سرتاسر غلطی پر ہیں۔ قرآن مجید ظلم و زیادتی کی ہر قسم کو حرام کرتا ہے۔ غلامی اس ظلم کی بدترین شکل ہے اور اس کا دوبارہ شروع کرنا ایک بدترین جرم ہے۔

ابو یحییٰ

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (13)

دلائل آخرت: مقصدیت کی دلیل

آخرت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید میں بیان ہونے والی مقصدیت کی دلیل دراصل ذہن انسانی کے کچھ اشکالات اور سوالات کا جواب ہے۔ ان سوالات کا جواب جب نہ دیا جائے تو انسان آخرت ہی کا نہیں خدا کی ہستی کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس دلیل کو سمجھنے کے لیے انسانی ذہن کے ان سوالات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ یہ بنیادی سوالات مندرجہ ذیل ہیں۔

انسان اور دوام زندگی

انسان جس دنیا میں جیتا ہے، اسے جب ایک حساس انسان کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے تو یہ عجیب و غریب تضادات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ اس دنیا میں انسان نامی ایک مخلوق بستی ہے۔ یہ مخلوق ذہن، سوچ، ارادہ اور اختیار رکھتی ہے۔ یہ زندگی کی تمنا اور اپنے ہونے کا احساس رکھتی ہے۔ یہ ذوق جمال، حسن اور محبت کا ادارک رکھتی ہے۔ یہ خوبصورتی، لذت، ذائقے اور خوشبو کو محسوس کر کے اس سے لطف لیتی ہے۔ یہ نغمہ و آہنگ سے حظ اٹھاتی، فن اور شعر کو داد دیتی رنگ و زیبائش سے محظوظ ہوتی اور صنعت و کاریگری سے استفادہ کرتی ہے۔ یہ خیر و شر کا شعور، انسانیت کا لحاظ، نیکی و ہمدردی کے جذبات اور رشتے ناطوں کی پہچان رکھتی ہے۔ یہ قربانی اور ایثار کی اعلیٰ ترین صفات کا شعور رکھتی اور ان کے لیے جان تک دے دیتی ہے۔ یہ بہتر سے بہتر اور برتر سے برتر کی جستجو میں مشغول رہتی ہے۔ ارتقا اور تنوع کی خواہش رکھتی ہے۔ یہ ویرانوں کو آباد کرتی اور

بیانوں میں شہر بساتی ہے۔ گویا ہر پہلو سے یہ مخلوق ہوتے ہوئے خالق کا کردار ادا کرتی ہے۔

تاہم یہ انتہائی غیر معمولی مخلوق جس کی مثال اور مقابل کی کوئی اور چیز اس وسیع و عریض کائنات میں نہیں پائی جاتی ہے، اس کی کل بساط ساٹھ ستر برس کے بعد ہمیشہ کے لیے مٹی میں دفن ہو جاتی ہے۔ ایک مچھلی، ایک بکرا، ایک شیر، ایک کوا، ایک سانپ، ایک درخت، ایک پھول، ایک پھل اگر اپنا وجود کھو دے تو یہ سوال اس طرح نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بھی زندہ سہی مگر ذوق زندگی نہیں رکھتے۔ ایک جانور مر جائے تو دوسرا جانور اس کی جگہ لے لیتا ہے، ایک پھول مرجھا جائے تو دوسرا پھول گلستان کو سجا دیتا ہے۔ مگر ایک انسان مر جائے، اقبال مر جائے، غالب مر جائے، میرے اور آپ کے والدین رخصت ہو جائیں تو ان کی جگہ اور کوئی کیسے لے سکتا ہے؟ انسان جیسی بامعنی مخلوق، باذوق ہستی، باشعور وجود جب مرتی ہے تو صفحہ ہستی پر اس سے بڑا سانحہ کوئی نہیں ہوتا۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ صاحب اختیار، صاحب ارادہ، صاحبِ ذوق جمال انسان اس دنیا میں ایک صدی بھی نہیں جیتا لیکن پتھر اور چٹانیں کروڑوں برس اپنی جگہ استادہ رہتے ہیں۔ یہ کیسا سانحہ ہے کہ مصور کی تصویر، فنکار کا نغمہ، سنگراش کا شاہکار، شاعر کی غزل رہ جاتی ہے، مگر وہ مر جاتا ہے۔

عام لوگ اس حقیقت کو اس لیے نہیں مانتے کہ ان کی عقل اور احساس اس کو قبول کرنا چاہتا ہے۔ وہ مجبوری میں دوسری راہ نہ پا کر موت کے جبر کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ مگر ایک حساس آدمی کا جب اس حقیقت سے سامنا ہوتا ہے تو وہ چلا اٹھتا ہے۔ عام آدمی موت کے وقت رو کر اور چلا کر اپنے دکھ کا اظہار کر دیتا ہے اور اقبال جیسے خاص لوگ اس سانحے پر ماتم کرتے ہیں تو ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' جیسی لافانی نظم وجود میں آتی ہے جو آج بھی ہر پڑھنے والے کو اپنے مرحوم والدین کو یاد کر کے رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

رونا انسان کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے، مگر یہ سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا ہے اگر اس دنیا

میں کوئی معنویت ہے تو انسان جیسی بامعنی مخلوق کا مقدر موت کیوں ہے؟ یہاں زندگی ہے تو دوام زندگی کیوں نہیں؟

انسان اور کمال زندگی

انسان زندگی ہی نہیں چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ جب تک جیے زندگی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہو۔ مگر یہاں قدم قدم پر وہ رکاوٹیں ہیں جو اس سے جینے کا مزہ چھین لیتی ہیں۔ انسان سکون کی زندگی جینا چاہتا ہے۔ مگر محرومی کا طوفان بار بار اس کی دنیا الٹ دیتا ہے۔

یہاں جوانی کے ساتھ بڑھاپا لگا ہوا ہے جو ایک توانا انسان سے اس کی ہر طاقت چھین لیتا ہے۔ یہاں صحت کے ساتھ بیماری لگی ہوئی ہے جو انسان کے وجود کو سراپا اذیت بنا دیتا ہے۔ یہاں زندگی کے ساتھ معذوری لگی ہوئی ہے جو جب کبھی لاحق ہو جائے تو انسان کو زندگی کی دوڑ سے باہر نکال پھینکتی ہے۔ یہاں فراخی کے ساتھ غربت لگی ہوئی ہے جو زندگی کو انسان کے لیے مصیبت بنا دیتی ہے۔ یہاں خواہش کی تکمیل کی راہ میں فیصلہ کن طور پر محدودیت حائل ہے۔ ہم لذیذ ترین کھانے کو چند لقموں سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ بہترین مشروب کو چند گلاس سے زیادہ نہیں پی سکتے۔ یہی محدودیت زندگی کا مزہ کرکرہ کر دیتی ہے۔ یہاں خوشی اور مزے کے ساتھ بوریت لگی ہوئی ہے۔ پسندیدہ ترین نغمہ چند دفعہ سننے کے بعد بے اثر ہو جاتا ہے۔ بہترین غذا روزانہ کھانے کے بعد بے مزہ ہو جاتی ہے۔ یہ بوریت انسان کو زندگی کے حسن سے محروم کر دیتی ہے۔

یہ سب کچھ اس انسان کے ساتھ ہو رہا ہے جس کی خواہش اس کائنات کی طرح لامحدود ہے۔ جو سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ مگر اس کا دامن تنگ پڑ جاتا ہے۔ وہ سکون چاہتا ہے مگر بڑھاپا، بیماری، معذوری، غربت، محدودیت اور بوریت انسان کو بے چینی کے صحرا میں بھٹکتا چھوڑ دیتے ہیں اور وہ کبھی منزل مراد تک نہیں پہنچ پاتا۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں

مدر ٹریسا جیسی خاتون جس نے ساری زندگی انسانوں کے دکھ دور کرتے ہوئے اور مذہب کے نام پر تیاگ دی، اس بنیاد پر خالق کے وجود پر شک میں مبتلا ہوگئی کہ دنیا میں اگر غربت، بیماری اور معذوری کے یہ دکھ پائے جاتے ہیں تو پھر خدا کا ہونا بہت مشکل ہے۔

خدا کو جیسے تیسے مان بھی لیا جائے تب بھی یہ تلخ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ جب ہر خالق اپنی تخلیق کو عیوب سے پاک رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے تو اس زندگی کے خالق نے اسے محرومی اور مصائب کی ان گنت اقسام سے داغدار کیوں کیا؟ اگر اس دنیا میں کوئی مقصدیت ہے تو یہاں شر اور خرابی اس درجے عام کیوں ہے؟ اس دنیا میں اگر زندگی ہے تو کمال زندگی کیوں نہیں؟

انسان اور عدل

عدل انسان کی فطرت کی طلب ہے۔ وہ انصاف کو زندگی کی بنیاد سمجھتا ہے۔ مگر اس دنیا میں عدل نہیں پایا جاتا۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ یہاں ذہین سے ذہین آدمی جوتیاں چٹخاتا رہ جاتا ہے جبکہ احمق اور ناکارہ لوگ اربوں میں عیش کرتے رہتے ہیں۔ چلیے انسان مال کمانے کی کوشش کر کے کچھ نہ کچھ اپنے حالات بہتر کرلے، مگر مال ہی کیا دیگر بہت سے پہلوؤں سے لوگوں میں ایسی تفریق پائی جاتی ہے جس کی کوئی تاویل اور کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ حسن، ذہانت، قد و قامت اور دیگر فطری اور قدرتی صلاحیتیں کس سے پوچھ کر بانٹی گئی ہیں؟ کچھ لوگ اعلیٰ خاندانوں اور ترقی یافتہ ممالک میں کیوں پیدا ہوجاتے ہیں؟ ان میں ایسی کیا خوبی ہے جو کسی غریب یا کم صلاحیت والے کے ہاں پیدا ہونے والے بچے میں نہیں؟

پھر اس دنیا کا نظم عجیب اصولوں پر چل رہا ہے۔ سکندر اعظم حملہ کرتا ہے اور یونان سے ہندوستان تک ایک دنیا فتح کرلیتا ہے۔ تاتاریوں کی آندھی اٹھتی ہے اور وسط ایشیا سے مشرق وسطیٰ تک کے مسلمانوں کو روندھتی چلی جاتی ہے۔ ہٹلر جرمنی کا حکمران بنتا ہے اور یورپ کے

کروڑوں لوگ دوسری جنگ عظیم میں اس کی ہوس اقتدار کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ان فتوحات، ان جنگوں اور ان یلغاروں میں جو ہوس اقتدار کا شکار چند لوگوں کی تسکین کے لیے برپا کی گئی ہیں، عام آدمی پر جو گزرتی ہے، وہ جس طرح قتل ہوتا ہے، اس کا خاندان جیسے برباد ہوتا ہے، اس کی عورتیں جیسے پامال ہوتی ہیں، اس کے بچے جیسے مارے جاتے ہیں، اس کا اسباب جیسے لٹتا ہے، وہ دلوں کو ہلا دینے والی داستان ہے۔ ایک حساس انسان بے اختیار چیخ اٹھتا ہے کہ اس دنیا کا اگر کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟ یہ دنیا اگر کسی اصول پر بنی ہے تو وہ کیا ہے؟

جب انسان کو اس سوال کا جواب نہیں ملتا اور اکثر لوگوں کو نہیں ملتا تو تین ردعمل سامنے آتے ہیں۔ ایک فکری ردعمل جس کی نمائندہ مثال برٹینڈ رسل ہے، جس نے اپنی تصنیف Why I am not a christian? میں ایسی ہی چیزوں کی بنیاد پر خدا کے وجود پر سوال اٹھادیا۔ دوسرا ردعمل رہبانیت کی وہ تحریک ہے جس کی نمائندہ مثال سدھارتھ گوتم بدھ ہے۔ وہ مسائل زندگی سے ناواقف ایک شہزادہ تھا جس نے پہلی دفعہ جب ایک جنازے، بیمار اور بوڑھے کو دیکھا تو تخت و تاج اور ریاست چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر کے اس میں سکون ڈھونڈنے لگا۔ تیسرا ردعمل وہ ہے جو عام لوگ اختیار کرتے ہیں کہ ان سوالات سے آنکھیں بند کر کے جو لذت دنیا مل سکتی ہے، ہر خیر و شر سے بے نیاز ہو کر اختیار کی جائے۔ مگر اس عمل کے نتیجے میں دنیا میں ظلم و فساد اور بڑھ جاتا ہے اور خود ایسے لوگ بھی کبھی حقیقی سکون نہیں پاتے اور بے نیل و مراد اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ اہم ترین سوالات ہیں جنھوں نے ہر دور میں فکری اور عملی انسانوں کو مذہب سے دور کیا ہے اور ان کے جواب کے بغیر کوئی مذہب انسانی فطرت کا جواب نہیں ہو سکتا۔

[جاری ہے]

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (17)

ترکی کے حمام

فوارے پر بیٹھ کر شاورما کھانے کے بعد ہم دوسری جانب چل پڑے۔ تھوڑی دور جا کر ایک جگہ "حمام" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ترکوں کی معاشرت میں حمام کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ہاں حمام محض نہانے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے بلکہ اس کی ایک مخصوص سماجی اہمیت ہے۔ قدیم دور میں سیورج کا نظام نہ ہونے کے باعث گھروں میں بیت الخلا اور نہانے دھونے کا انتظام کرنا مشکل ہوا کرتا تھا، اس زمانے میں حمام بنائے جاتے جن میں تازہ ٹھنڈے اور گرم پانی اور اس کی نکاسی کا اہتمام کیا جاتا۔ حمام ایک بڑے سے ہال کی صورت میں ہوا کرتا جس میں لوگ انڈر وئیر وغیرہ پہن کر نہایا کرتے۔ مردوں اور خواتین کے لئے علیحدہ حمام ہوا کرتے تھے۔ ان حماموں میں غسل کے علاوہ مساج پارلر بھی ہوتے تھے۔ لوگ مساج کروانے کے ساتھ ساتھ گپ شپ بھی لگایا کرتے۔ اس طریقے سے حمام ایک سوشل سینٹر کی صورت اختیار کر جایا کرتا تھا۔

ابن بطوطہ اپنے دور میں ترکی کے حماموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہاں بعض ایسے حمام دیکھے جہاں مرد اپنی لونڈیوں کو لے کر گھس جاتے تھے اور بغیر کسی ستر کے غسل کیا کرتے تھے۔ کسی بھی باحیا انسان کی طرح انہیں یہ بات سخت ناگوار گزری اور انہوں نے قاضی شہر سے کہہ کر اس رسم کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کے باشندوں کی بے حیائی کا ذکر کرتے ہوئے ابن بطوطہ بیان کرتے ہیں:

اس شہر کے لوگ برائی کو نہیں روکتے۔ یہی معاملہ اس ملک کے اکثر افراد کا ہے۔ یہ لوگ روم کی خوبصورت لونڈیوں کو خریدتے ہیں اور انہیں فساد پھیلانے (عصمت فروشی) کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہر لونڈی نے ایک مخصوص رقم اپنے مالک کو ادا کرنا ہوتی ہے۔ میں نے تو یہاں تک

سنا ہے کہ لونڈیاں مردوں کے ساتھ حمام میں چلی جاتی ہیں۔ جو شخص فساد کا یہ کام حمام کے اندر کرنا چاہے، اسے کوئی نہیں روکتا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اس شہر کے قاضی نے بھی اسی طریقے سے لونڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بے حیائی صرف دور جدید کا فتنہ ہی نہیں ہے۔ سابقہ ادوار میں بھی بے حیائی پائی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں فرق یہ پڑا ہے کہ میڈیا نے اسے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا ہے۔ عیاش لوگ پہلے زمانوں میں بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے جو آج کل ہوتا ہے۔ خدا پرست لوگ اس دور میں بھی ایسے کاموں سے اجتناب کرتے تھے اور جدید دور میں بھی ایسی حرکتوں سے دور رہتے ہیں۔

ترکی کے ٹورسٹ بروشرز میں حمام کا بہت شد و مد سے ذکر کیا گیا تھا۔ آج کل حمام کے ساتھ اسٹیم اور سوانا باتھ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ مساج کرنے کے بعد شاکنگ شاور کے تجربے کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ شاور کے بعد ماربل کے پلیٹ فارم پر آرام کیا جاتا ہے۔ کچھ بروشرز سے ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ان میں مرد و خواتین اکٹھے غسل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمیں یہ جرأت نہ ہو سکی کہ ہم کسی حمام میں داخلے کا تصور بھی کر سکیں۔

محمد بولوی سے ملاقات

اب ہم واپس ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک سیاہ رنگ کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ میری خواہش تھی کہ کسی انگریزی بولنے والے سے ملاقات ہو سکے تاکہ کچھ یہاں کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں۔ میری اہلیہ ماریہ کے لئے شاور مالینے دکان پر چلی گئیں۔ اچانک ایک صاحب ہمیں دیکھ کر آئے اور کہنے لگے، "یو سپیک انگلش" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ان صاحب سے کافی دیر گپ شپ ہوئی۔

ان کا نام محمد تھا۔ پیشے کے اعتبار سے یہ انجینئر تھے اور سویڈن میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔

اس وجہ سے ان کی انگریزی کافی بہتر تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگے، "آپ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے کہا، "پاکستان سے مگر ان دنوں جدہ میں مقیم ہوں۔" بڑے خوش ہوئے اور بتانے لگے کہ سویڈن میں ان کے روم میٹ پاکستانی تھے اور ہوسٹل میں ان کے ساتھ کئی پاکستانی رہا کرتے تھے۔

جس طرح ہم لوگ دوسری اقوام کی عجیب وغریب عادات کے بارے میں سن اور پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں اور ان کا ریکارڈ لگاتے ہیں، بعینہ یہی معاملہ ان کا ہمارے بارے میں ہے۔ محمد ریکارڈ لگانے کے سے انداز میں کہنے لگے: "مجھے تو پاکستانی بھائیوں کی یہ بات بڑی عجیب لگی کہ وہ روزانہ روٹی پکاتے تھے۔" مجھے اس وقت تو ان کی بات سمجھ میں نہ آئی مگر اگلی صبح ناشتے پر ان کی بات کا اندازہ ہوا۔

ہم جس مجسمے کے پاس کھڑے تھے، اس کے بارے میں وہ بتانے لگے کہ یہ شہر کے ایک بہت ہی نیک شخص کا ہے۔ ان صاحب نے بہت سے طلباء وطالبات کو وظائف دیے اور بولو شہر کے لئے تعمیر کا بہت سا کام کیا ہے۔ اظہار تشکر کے طور پر ان کا مجسمہ شہر کے مرکزی چوک میں نصب کیا گیا ہے۔ ان کی بات سے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حدیث یاد آئی کہ سابقہ اقوام میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ نیک افراد کے مرنے کے بعد ان کے مجسمے بنا لیے جاتے تھے تاکہ ان کی یاد تازہ رہے۔ کئی نسلوں کے بعد یہ مجسمے مقدس حیثیت اختیار کر جایا کرتے تھے اور ان کی پوجا شروع ہو جاتی تھی۔

محمد ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اسلامی تاریخ پر ان کی نظر گہری تھی۔ انہوں نے بولو کے گردونواح سے متعلق قیمتی معلومات مجھے فراہم کیں۔ میں نے ان سے اپنے ترکی کے سفر کے منصوبہ پر بات چیت کی تو وہ کافی متاثر ہوئے۔ کہنے لگے، "لگتا ہے، آپ ترکی کے جغرافیے کا گہرا مطالعہ کر کے آئے ہیں۔"

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

جو لگے گی واں عدالت

نہ یہ ظلمتیں رہیں گی،نہ سیاہ رات ہو گی
یہ جہاں نہیں رہے گا تو خدا کی ذات ہوگی
جو گھڑی ہے فیصلے کی وہاں حق کی بات ہو گی
نہ تو جھوٹ کی چلے گی نہ ہی سچ کو مات ہو گی
وہ حقیقی محتسب ہے وہی فیصلہ کرے گا
جو لگے گی واں عدالت تو وہیں پہ بات ہوگی
میں یقین کی حدوں سے تری راہ پر چلی ہوں
تیری بے شمار رحمت میرے ساتھ ہوگی
یہاں غم بھی عارضی ہیں تو خوشی بھی عارضی ہے
یہاں جیت جیت ہوگی نہ ہی مات، مات ہوگی
وہ نبیؐ ختم مرسل، میرا میرِ کارواں ہے
اسی راہ پر چلوں گی تو میری نجات ہوگی

جو لوگ ایمان اور اخلاق کی راہ پر چلتے ہیں
جنت خود ہی ان منزل بن جاتی ہے اور
جو لوگ خواہش اور تعصب کی راہ پر چلتے ہیں
جہنم خود بخود ان کی منزل بن جاتی ہے

جنت کی کامیابی کون پائے گا

''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو:

اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

اور لغویات سے دور رہتے ہیں۔

اور زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے ہیں۔

اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے اور لونڈیوں کے حد تک، کہ ان پر (محفوظ نہ رکھنے میں) وہ قابل ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔

اور اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں۔

اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وہ وارث ہیں جو میراث میں فردوس پائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (المومنون 23:11-1)

حدیث: حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے (ایک طویل حدیث میں) روایت ہے کہ آنے والے شخص نے (جو درحقیقت جبرائیلؑ تھے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: بتائیے ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو، اس کے فرشتوں کو، اس کی بھیجی ہوئی کتابوں کو، اس کے رسولوں کو اور آخرت کو حق جانو اور حق مانو، اور اس بات کو بھی مانو کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ چاہے وہ خیر ہو چاہے شر۔ (مسلم)